(غلام گردش)

افریقہ کی سمیا اور پاکستان کا سعد

سمیا عمر یوسف، افریقی ملک صومالیہ میں پیدا ہونے والی عام سی لڑکی تھی۔ سیاہ رنگ اور سپاٹ چہرہ۔ کوئی بھی ایسی خوبی نہیں تھی جو اسے دوسروں سے ممتاز بنائے۔ مگر لوگوں کو ایک سچ کا علم نہیں تھا۔ سمیا ایک پیدائشی اتھلیٹ تھی۔ ایک ایسی بچی جسے قدرت نے مضبوط ترین جسم اور اس سے بھی مضبوط روح عطا کی تھی۔ جس طبقے سے سمیا کا تعلق تھا، اس میں بنیادی سہولتوں کا فقدان نہیں بلکہ تصور ہی نہیں تھا۔ مگر سمیا نے کسی بھی آسائش کے بغیر دوڑنے کا عمل شروع کر دیا۔ اسکے پاس جوتے تک نہیں تھے۔ ننگے پیر بھاگتی تھی۔ رفتار ناقابل یقین تھی۔ دو سو میٹر کے میدان میں ایسے لگتا تھا کہ سمیا عمر تیز رفتاری سے بھاگ نہیں رہی بلکہ ہوا میں چوکڑیاں بھر رہی ہے۔ ہوا میں تیر رہی ہے۔ یہ برق رفتاری قدرت کا عطیہ تو تھا ہی، مگر بچی کا جنون اور شوق، اسے مہمیز دیتا رہتا تھا۔ ملک میں تیز رفتاری کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ اب اسکا ایک ہی خواب تھا۔ دنیا میں ریس کی چمپئن بنے۔ اولمپک کے مقابے میں حصہ لے اور پوری دنیا کو حیران کر ڈالے۔ سب کو یقین تھا کہ سمیا دوڑنے میں ناقابل شکست ہے۔ اسے اولمپک مقابلوں میں حصہ لینے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بین الاقوامی سطح پر اپنے کھیل میں حصہ لینے کیلئے سمیا نے انتہائی محنت شروع کر دی۔ ریاضت کرنی شروع کر ڈالی۔ 09-2008 میں صومالیہ کے دارالخلافہ، موگا دیشو سٹیڈیم میں دن رات ٹریننگ کرتی رہتی تھی۔

اسی اثناء میں، ملک میں اسلامی بنیاپرست جماعت، اَل شباب حد درجہ طاقتور ہوگئی۔ صومالیہ کے اکثر حصے اَل شباب کے قبضہ میں چلے گئے۔ جماعت کے عہدیداران نے لڑکیوں کیلئے ہر کھیل پر پابندی لگا دی۔ یہ اعلان بھی کر ڈالا کہ لڑکیوں کیلئے ریس میں حصہ لینا مذہب کے خلاف ہے۔ تقریباً تمام ملک میں یہ پابندی عائد کر دی گئی۔ لڑکیوں کو تو خیر گھر بٹھا ہی دیا گیا۔ مگر تمام لڑکے جو کھیلوں میں دلچسپی رکھتے تھے، انکو لشکر میں زبردستی شامل کر دیا گیا۔ یعنی اب ہر زور آور نوجوان اَل شباب کا سپاہی تھا۔ سمیا صرف اس وجہ سے بچ گئی کہ وہ صومالیہ کے دارالخلافہ میں رہتی تھی۔ بنیاد پرست دارالخلافہ سے صرف دو میل دور گئے تھے۔ روز خبریں آتی تھیں کہ موگا دیشو پر آج قبضہ ہوا کہ آج۔ بے یقینی کے بادل ہر طرف پھیل رہے تھے۔ خوش قسمتی سے دارالخلافہ، اَل شباب کے قبضہ میں نہ آسکا۔ ہر طرح کے حالات سے دور، سمیا صرف اپنی دھن میں مصروف تھی۔ سٹیڈیم میں تیز بھاگنے کی پریکٹس۔ سہولتیں تو تھی ہی نہیں۔ اچھا کوچ تو دور کی بات، ریس میں حصہ لینے کیلئے اسکے پاس جوتے تک نہیں تھے۔ بالکل بے یار و مددگار۔ مگر عظم و ہمت کی تصویر۔ صومالیہ سے 2008 کی اولمپک کیلئے جس ٹیم کا انتخاب کیا گیا، سمیا اسکا اہم ترین حصہ تھی۔ ایک تجارتی کمپنی نے دوڑنے والے جوتے بھی عطیہ کر دیے۔ چین میں منعقد اولمپک سمیا کی زندگی کا بلند ترین لمحہ تھا۔ جیسے ہی ریس کا افتتاح ہوا، سمیا نے پوری طاقت کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ اسکی پھرتی اور ہمت دیکھ کر پورا سٹیڈیم دیوانہ وار تالیاں بجانے لگا۔ سمیا اس ریس میں ہار گئی۔ مگر جسمانی استطاعت اور ٹیلنٹ نے سب لوگوں کو اسکا فین بنا دیا۔ وہ جہاں جاتی تھی، لوگ اسکے ساتھ تصویریں بنواتے تھے۔ سمیا کو اولمپک میں حصہ لیکر پتہ چل گیا تھا کہ اسے کیوں شکست ہوئی ہے۔ اسکے ملک یعنی صومالیہ میں جدید ٹریننگ کیلئے کوئی اسٹیڈیم اور کوچ موجود نہیں ہے۔ کوئی ایسا ادارہ نہیں جو دوڑنے کیلئے ماڈرن

طریقوں پر مشق کا اہتمام کر پائے۔صومالیہ واپس آ کر اس کمزوری کو دور کرنے کیلیے ہر وقت سوچنا شروع کر دیا۔دوستوں اور ریس کے شعبہ سے منسلک کھلاڑیوں نے سمیا کو بتایا کہ جدید فنی سہولتیں صرف اور صرف مغربی ممالک میں موجود ہیں۔جب تک وہ کسی مغربی ملک میں نہیں پہنچتی،اسکا کوئی مستقبل نہیں۔صومالیہ کے ناگفتہ حالات میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔اس نے انسانی سمگلرز سے رابطہ کیا۔انسانوں کی سمگلنگ کرنے والے گروہ پوری دنیا میں موجود ہیں۔انہی کے ذریعے سوڈان،ایتھوپیا اور لیبیا تک پہنچ گئی۔چاہتی تھی کہ کسی بھی طریقے سے اٹلی پہنچ کر ٹریننگ کرے اور 2012 کے اولمپک مقابلوں میں حصہ لے۔سمگلروں نے سمیا اور سو کے قریب بدقسمت لوگوں کو ایک پرانی سی کشتی میں بٹھا دیا۔سمندر میں دو دن سفر کرنے کے بعد کشتی میں پٹرول ختم ہو گیا۔تھوڑی دیر کے بعد خستہ حال کشتی،سمندری طوفان کا مقابلہ نہ کر سکی اور کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔سارے مسافر سمندر برد ہو گئے۔اس میں صومالیہ کی اولمپک اتھلیٹ سمیا بھی شامل تھی۔جدید سہولتوں کی تلاش میں اٹلی پہنچنے کی کوشش میں سمندر کی خوراک بن گئی۔آج تک سمیا کی لاش نہیں مل سکی۔اسکا جرم صرف یہ تھا کہ ترقی کے خواب دیکھتی تھی۔ایسے خواب جو آبائی ملک پورے نہیں کر سکتا تھا۔سنہرے خواب، جو دیکھنا اسکا بنیادی حق تھا۔مرتے وقت اسکی عمر صرف اکیس برس تھی۔

بالکل اسی طرح اسی سمندر،یعنی بحیرہ روم میں صرف چند دن پہلے کشتی ڈوبنے کا ایک اور سانحہ پیش آیا۔اس میں بھی سو کے قریب لوگ تھے۔پینتیس پاکستانی بھی تھے۔ان میں گجرات سے تعلق رکھنے والا اسماعیل بھی شامل تھا۔نوجوان شخص۔شادی ہوئے صرف چند برس ہوئے تھے۔اسکے ساتھ اہلیہ اور پانچ سال کا بیٹا سعد بھی تھا۔والد اور والدہ نے سعد کو بتایا تھا کہ جیسے ہی وہ لیبیا سے روانہ ہونگے۔بس چند گھنٹے بعد اٹلی پہنچ جائینگے۔وہاں ہر طرح کی سہولت ہوگی۔سماجی انصاف،روزگار کے وسیع مواقع اور بہترین زندگی۔سعد کو بھی بہت شوق تھا کہ ایک بہت اچھے سکول میں تعلیم حاصل کرے۔گجرات کے ایک مقامی سکول میں پڑھنے والا سعد،اپنی عمر کے مطابق خواب دیکھنے میں مصروف تھا۔چند دوستوں کو بتا رکھا تھا کہ والد کے ساتھ گوروں کے دیس میں جا رہا ہے۔جہاں اسکول میں تختی اور قلم دوات نہیں ہوگی۔بلکہ تمام تعلیم کمپیوٹر پر دی جائیگی۔رات کو سعد سوتے ہوئے خواب میں دیکھتا تھا کہ ایک صاف ستھرے اسکول کے ایک کمرے میں بیٹھا ہے۔انگریز ٹیچر اسے بڑی محبت سے پڑھا رہی ہے۔ٹیبل پر اسکے لیے چھوٹا سا کمپیوٹر بھی رکھا ہوا ہے۔سکول میں کھیلنے کیلئے بڑے بڑے گراؤنڈ ہیں۔جس میں انگریز بچوں کے ساتھ فٹ بال کھیل رہا ہے۔خواب میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ اسکا والد اسماعیل،بڑی سی گاڑی میں اسکول چھوڑنے آتا ہے اور واپسی بھی اسی بڑی گاڑی میں ہوتی ہے۔گھر میں ہر طرح کی سہولت موجود نظر آتی تھی۔سعد کے والد،اسماعیل نے زندگی بہتر بنانے کیلئے بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔انسانی سمگلروں کے ذریعے غیر قانونی طریقے سے اٹلی پہنچنے کا ارادہ۔قرض وغیرہ لیکر اس گروہ کو بارہ لاکھ روپیہ دیا۔پھر وہی موت کا سفر شروع ہو گیا۔ایک ملک سے دوسرے ملک،دوسرے سے تیسرے اور پھر لیبیا۔یہاں سے سمندر پار کرنے کیلئے بردہ فروشوں نے بوسیدہ سی کشتی کا انتظام کر رکھا تھا۔ایک شام کو اٹلی جانے کیلئے کشتی میں سوار ہوئے۔پھر وہی ہوا،جو کھیل تقریباً روز ہوتا ہے۔کشتی سمندر میں ڈوب گئی۔سارے مسافر مارے گئے۔سعد اور اسکے والد اسماعیل بھی سمندر کا بے جان حصہ بن گئے۔پانچ سالہ سعد،زندگی میں کبھی اچھے سکول نہ جا سکا۔بلکہ سمندری مچھلیوں کی خوراک بن گیا۔اسکی لاش کسی

کو بھی نہ مل سکی۔

صومالیہ کی سمیا اور پاکستان کے سعد میں آپکو کچھ بھی مشترک نظر نہیں آئیگا۔ انکا آپس میں کسی طرح کا ربط بھی محسوس نہیں ہوگا۔ دو مختلف ممالک کے شہریوں کی سچی کہانیاں ہیں جو ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہیں۔ انکی زبان اور ہے، معاشرتی روایات بالکل مختلف ہیں، تہذیب وتمدن بھی آپس میں میل نہیں کھاتا۔ انکی جلد کا رنگ بھی بالکل مختلف ہے۔ مگر غور سے دیکھیے، سوچیے، تو دونوں میں ہر چیز یکساں ہے۔ دونوں ایک بہتر مستقبل کا خواب دیکھ رہے تھے۔ کامیابی کے سنہرے گھوڑے پر سوار ہونا چاہتے تھے۔ سعد اور اسے والد اسماعیل، ایک اجنبی مگر بہتر ملک کے شہری بننا چاہتے تھے۔ سمیا عمر یوسف بھی بالکل یہی چاہتی تھی۔ انکے خواب بھی ایک جیسے تھے اور پھر مقدر بھی۔ دونوں، ایک ہی ملک یعنی اٹلی جانا چاہتے تھے۔ دونوں، ایک ہی سمندر میں، یکساں حالات میں ڈوب کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ غور کیجئے، تو ان لوگوں نے مر کے ہمارے جیسے ممالک کے اصل حالات کو دنیا کے سامنے برہنہ کر ڈالا۔ بتا دیا کہ ان جیسے ملکوں میں عوام پر زندگی اور ترقی کا ہر دروازہ بند کر دیا گیا ہے۔ سارے دعوے جھوٹے اور ترقی کے بلند و بانگ نعرے مکمل طور پر دروغ گوئی پر مبنی ہیں۔ عام لوگ، بالکل جانوروں کی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور کر دیے گئے۔ وہ صرف سانس لے رہے ہیں۔

سمیا اور سعد دونوں نے ملکر، جھوٹ کے دروازے کے پٹ کھول کر رکھ دیے ہیں۔ ننگا سچ بالکل سامنے آ گیا ہے۔ سانحہ ہونے کے بعد، اخباروں میں آیا کہ حکومتی اداروں نے گجرات اور اسکے اردگرد، کئی بین الاقوامی انسانی سمگلروں کو گرفتار کر لیا ہے۔ یہ اقدامات صرف مضحکہ خیز نہیں، بلکہ انتہائی ادنیٰ درجے کے ہیں۔ ایف آئی اے اور دیگر اداروں کو سو فیصد معلوم ہے کہ وسطی پنجاب میں موت کے سوداگر کون کون ہیں۔ انکی پشت پناہی کون سے طاقتور اشخاص کر رہے ہیں۔ انکو کس درجہ کی سیاسی حفاظت میسر ہے۔ کون سا اعلیٰ سرکاری ملازم اور کون سا سیاستدان، جبر کے اس کھیل میں ملوث ہے۔ مگر چند دنوں کی جزوی اور نیم دلانہ حرکت صرف اور صرف اسلیے ہے کہ سعد اور اسکے خاندان کے مرنے کی خبر، اخباروں میں شائع ہوگئی۔ ورنہ کون پوچھتا ہے، اور کسے فکر ہے۔ عملی طور پر ہمارے سارے ائیر پورٹ بکے ہوئے ہیں۔ پیسے دیکر جب چاہیں، جہاں چاہیں، بلا روک ٹوک جا سکتے ہیں۔ کوئی آپکو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ بلکہ سرکاری عمال جہاز کی نشست تک حفاظت سے بٹھا کر آئینگے۔ ہماری بندرگاہوں کا بھی یہی حال ہے۔ بری راستوں پر چوکیوں کا دھندا بھی یہی ہے۔ پیسہ دیکر آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

مگر دوسری طرف بھی دیکھیے۔ فوجی ڈکٹیٹروں سے لیکر سیاسی آمراؤں نے ساٹھ برس سے لوگوں کو جھوٹ کی تلوار سے مفتوح کیا ہوا ہے۔ ہر قائد، اپنی اپنی راگنی الاپتا ہے۔ بے مثال ترقی، حیران کن اعداد وشمار، خیرہ کن اشتہاری دعوے۔ مگر عام انسان وہیں کا وہیں ہے۔ اس ملک میں اسکا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اپنے بنیادی خواب پورے کرنے کیلئے، سمندر میں ڈوبنے کیلئے بھی تیار ہے۔ تیسری دنیا کے تمام ممالک کا ایک جیسا المیہ ہے۔ ایک جیسے جھوٹ ہیں۔ ایک جیسے قائدین ہیں۔ شائد جلد کا فرق ہو۔ مگر سمیا اور سعد کی موت، ہمارے پورے نظامِ حکومت، نظامِ انصاف اور سماج پر زوردار چانٹا ہے۔ شائد اسکی آواز کوئی سن پائے۔ مگر گونگے اور بہرے معاشرے کیا سنیں گے!